JOURNAL OF RESEARCH (URDU)

ISSN (Print): 1726-9067, ISSN (Online):1816-3424
Volume No. 41, Issue No.02

TITLE OF THE PAPER

قیام پاکستان کے بعد خواتین کی خودنوشتوں میں شناخت کا مسئلہ

AUTHOR(S)

* **Sadia Sher Haider**
Ph.D Scholar, Department of Urdu
University of Peshawar, Peshawar.
** **Dr. Rubina Shaheen**
Professor, Department of Urdu
University of Peshawar, Peshawar.

CONTACT
* sadwkhan804@gmail.com
** rubinauni@uop.edu.pk

HISTORY OF THE PAPER

Received on: Dec 07, 2025
Accepted on: Dec 31, 2025
Published on: Dec 31, 2025

DETAIL(S)

Volume No. 41, Issue No. 02, Page No: 01-13
Publisher:
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University
Multan (Pakistan)-60800

LICENSE
This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License
COPYRIGHT
©The author(s) 2025. ©Journal of Research (Urdu) 2025.
This publication is an open access article.

JOURNAL'S PROFILE

Journal of Research (Urdu) is a bi-annual "Y" category journal approved by Higher Education Commission of Pakistan.
It started in 2001 from Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan). At that time, it was owned by the Faculty of Languages & Islamic Studies. Later in 2008, Higher Education Commission of Pakistan recognized it as a research journal of Urdu in Category "Z". Since then, it is owned by the Department of Urdu, BZU, Multan. In 2014, it was upgraded and accepted for Category "Y".

CONTACT

Dr. Muhammad Asif
Editor, Journal of Research
Department of Urdu, BZU Multan-60800

MOBILE:
+92 333 6062921

WEBSITE:
https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

EMAIL:
jorurdu@bzu.edu.pk
muhammadasif12@bzu.edu.pk

ADDRESS

Office of the Journal of Research (Urdu), Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 41, Issue No. 2, Dec 2025

* سعدیہ شیر حیدر ** پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین

قیام پاکستان کے بعد خواتین کی خودنوشتوں میں شناخت کا مسئلہ

Identity issues in post-partition: Women's autobiographies

ABSTRACT

This study examines the struggles of women to define their identities in autobiographies written after the creation of Pakistan. It investigates how the Partition and the changes that followed affected women's personal and social understanding of who they were. By analyzing selected texts, the research explains how women described their inner conflicts, sense of loss, and challenges in adjusting to new roles in society. Their stories reveal the deep impact of migration, cultural pressure, and emotional trauma on their sense of identity. These autobiographies go beyond personal memories; they act as social and historical reflections of women trying to rebuild confidence and individuality in a new nation. The research concludes that women's autobiographical writings after Partition expose both the pain of dislocation and the courage to redefine the self.

KEYWORDS

Autobiographies, partition, migration, identity, historical, memories

ادب انسان کی داخلی اور خارجی کیفیات، خوابوں، محرومیوں اور جدوجہد کو صرف بیان ہی نہیں کرتا بلکہ انسانی وجود کی اصل پہچان کو بھی عیاں کرتا ہے۔ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے پس منظر میں ادب کو دیکھیں تو سب سے نمایاں تصویر انسانی وجود کی ٹوٹ پھوٹ کی نظر آتی ہے، اور اس میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والی ہستی عورت ہے جو تاریخ کے سب سے بڑے ہجرتی المیے کا براہِ راست شکار بنی۔ عورت محض ایک فرد نہ تھی بلکہ ایک پوری تہذیبی اور ثقافتی روایت کی امین تھی۔ یہی سبب ہے کہ قیام پاکستان کے بعد کی خواتین کی خودنوشتوں میں سب سے اہم اور سب سے پیچیدہ سوال عورت کی اپنی شناخت کا ابھرتا ہے۔ تقسیم کے بعد لاکھوں خواتین نے ہجرت کی، یہ ہجرت محض مکانی

تبدیلی نہ تھی بلکہ اپنی جڑوں، اپنے ماضی اور اپنی یادداشتوں سے کٹ جانے کا نام تھا۔ یہ کٹاؤ ان کی شناخت کو مجروح کرتا رہا، در حقیقت شناخت کا تصور جامد نہیں بلکہ کثیر الجہتی اور ارتقائی عمل ہے۔ ایک ہی فرد اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف شناختیں اختیار کرتا ہے، جو وقت، حالات اور معاشرتی دباؤ کے زیرِ اثر بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ اردو خودنوشت میں یہ تبدیلیاں صاف دکھائی دیتی ہیں، جہاں یہ خواتین اپنے ماضی اور حال کو ملا کر ایک نئی "ذات" تخلیق کرتی ہے۔اِس ضمن میں ڈاکٹر صبیحہ انور رقم طراز ہیں:

> ''عورت اپنی پہچان کے لیے صدیوں سے جدوجہد کر رہی ہے، مگر سماج نے اسے ہمیشہ کسی اور کے نام اور رشتے سے متعارف کروایا بیٹی، بیوی یا ماں کے طور پر گویا وہ اپنی کوئی شناخت نہیں رکھتی۔''(1)

خواتین کے بیانیوں میں شناخت کی تعمیر ہمیشہ ذاتی اور اجتماعی تجربات کے درمیان جھولتی رہی ہے۔ ان کے لیے اپنی ذات کو محض "انفرادی" طور پر بیان کرنا ممکن نہیں تھا، بلکہ ان کی تحریریں ان کے خاندانی، معاشرتی اور ثقافتی رشتوں کے آئینے کے بغیر ادھوری رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نسائی خود نوشتیں اکثر ''تعلقی شناخت'' (relational identity) کو جنم دیتی ہیں۔

ریاست کے قیام کے بعد عورت کو نئی اقدار، نئی ذمہ داریوں اور نئے خوابوں سے جوڑ دیا گیا۔ ایک طرف مذہبی و نظریاتی ریاست کا وہ تصور تھا جس میں عورت کو حیا اور عفت کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا، اور دوسری طرف عملی زندگی کی وہ حقیقت تھی جہاں عورت کو روزگار، تعلیم اور خاندان کی بقا کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا پڑی۔ یہی تضاد خواتین کی تحریروں میں شدت کے ساتھ جھلکتا ہے۔ وہ کبھی اپنے زخموں، کمزوریوں اور صدمات کو بیان کرتی ہیں اور کبھی اپنی جرات، مزاحمت اور بیداری کو اور یہی داخلی کشمکش ان خود نوشتوں کی روح ہے۔

ان تحریروں میں بار بار ایک سوال ابھرتا ہے: میں کون ہوں؟ کیا عورت کی پہچان صرف ایک بیٹی، بیوی یا ماں کی حیثیت تک محدود ہے یا پھر وہ ایک آزاد وجود بھی ہے؟ قیام پاکستان کے بعد یہ سوال صرف ذاتی نہیں رہا بلکہ ایک اجتماعی تجربہ بن گیا۔ ہجرت کے لٹے پٹے قافلے، عزت و عصمت کے خطرات، اجنبی زمین پر نئے سرے سے جڑ پکڑنے کی جدوجہد اور سماجی رویوں کی سختی نے عورت کو اپنی ذات کے گہرے تجزیے پر مجبور کیا۔ اسی لیے ان کی خود نوشتیں ذاتی یادداشتوں کے بجائے ایک پورے عہد کے کرب کی دستاویز ہیں۔ عصمت چغتائی اپنی خودنوشت میں لکھتی

ہیں:۔

''عورت کی تخلیق اس وقت مکمل ہوتی ہے جب وہ اپنی ذات کو پہچان لے۔''(2)

عصمت چغتائی کی ''کاغذی ہے پیرہن'' میں عورت کی داخلی خواہشات کو شناخت کا حصہ بنایا گیا۔ وہ عورت کو محض خاموش اور قربانی دینے والی ہستی نہیں مانتیں۔ ان کے ہاں تقسیم کا دکھ ایک تہذیبی شکست کی شکل میں سامنے آتا ہے جہاں عورت اپنی زبان، تہذیب اور خوابوں کے چھن جانے پر ماتم کرتی ہے۔ عصمت چغتائی کی خودنوشت ''کاغذی ہے پیرہن'' میں عورت کی شناخت کے مسئلہ کو نہایت جراتمندی سے پیش کیا گیا ہے۔ عصمت نے اپنے تجربات کے ذریعے بتایا کہ عورت کی شناخت کو ہمیشہ اخلاقی معیار کے ترازو میں تولا گیا، اور سماج نے اسے صرف کردار کی پیمائش سے متعین کرنے کی کوشش کی۔ وہ لکھتی ہیں کہ عورت کی اصل پہچان اس کے تخلیقی شعور، مزاحمتی قوت اور فکری آزادی میں پوشیدہ ہے۔ ان کی خودنوشت میں ''میں'' ایک فرد کے طور پر نہیں بلکہ ایک اجتماعی نسوانی شعور کے طور پر ابھرتا ہے۔ عصمت ایک جگہ پر کچھ یوں رقمطراز ہیں:۔

''میں عورت کے جسم اور اس کے احساس کو چھپانے کے بجائے دکھانا چاہتی ہوں تاکہ لوگ جان سکیں
کہ عورت صرف جسم نہیں ایک مکمل وجود ہے۔''(3)

اسی طرح کشور ناہید نے ''بری عورت کی کتھا'' میں سماجی جکڑبندیوں کو توڑا اور عورت کے خوابوں، جسم اور فکری آزادی کو شناخت کے ساتھ جوڑا، انھوں نے بتایا کہ عورت صرف مظلوم نہیں بلکہ اپنی ذات کو دریافت کرنے والی ایک باشعور ہستی ہے۔ ان تحریروں نے نہ صرف عورت کی شناخت کو محض روایتی خانوں تک محدود رکھنے والے رویوں کو چیلنج کیا بلکہ ثابت کیا گیا اور بتایا کہ عورت اپنی جدوجہد اور اپنی سوچ کے ساتھ ایک مکمل انسان ہے۔ کشور نے تمام باتیں نڈر انداز میں بیان کی ہیں۔ اپنی خودنوشت میں رقمطراز ہیں:۔

''میں بری اس لیے ٹھہری کیونکہ میں نے اپنی اندر کی عورت کو بولنے دیا۔''(4)

عصمت چغتائی اور کشور ناہید دونوں کے ہاں شناخت کا سوال بغاوت اور احتجاج کے پیرائے میں سامنے آتا ہے۔ دونوں اپنی خودنوشتوں میں سماجی اقدار اور مردانہ بالادستی کو چیلنج کرتی ہیں۔ فرق صرف لہجے اور اسلوب کا ہے۔ عصمت نے یہ بغاوت طنز و مزاح اور بیباکی کے ساتھ کی، جبکہ کشور ناہید نے اسے ایک تلخ مگر حقیقت پسند احتجاج میں ڈھالا۔ دونوں کے ہاں عورت کی اصل شناخت اس وقت ابھرتی ہے جب وہ معاشرتی اقدار سے ٹکرا کر اپنی آزادی کا

اعلان کرتی ہیں۔

بانو قدسیہ کی تحریروں میں عورت کی شناخت ایک روحانی اور اخلاقی جستجو کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اگرچہ ان کی خود نوشت ''راہِ رواں'' براہِ راست عورت کے حقوق پر نہیں، مگر اس میں بانو قدسیہ نے عورت کے اندرونی شعور اور اس کی فکری شناخت پر مکالمہ کیا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ عورت کی پہچان معاشرتی سانچوں سے باہر نہیں نکل سکتی جب تک وہ خود اپنی روحانی اور فکری قدروں کو از سرِ نو دریافت نہ کرے۔

یوں ان تحریروں کو پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد کی خواتین کی خود نوشتیں محض ذاتی بیانیے نہیں بلکہ ایک عہد کی اجتماعی روح کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں عورت کی ذات کی وہ پرتیں سامنے آتی ہیں جو رسمی تاریخ کی کتابوں میں نظر نہیں آتیں۔ یہ بیانیے ہمیں یہ بھی دکھاتے ہیں کہ عورت نے کس طرح اپنی شکستگی کو طاقت میں بدلا، اپنے دکھ کو آواز میں ڈھالا اور اپنی شناخت کے چراغ کو جلائے رکھا۔

ان تحریروں میں ہمیں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ عورت نے کس طرح اپنی شناخت کو لفظوں کے ذریعے محفوظ کیا۔ صدیوں تک اسے تاریخ کے مرکزی متن میں جگہ نہ ملی، مگر جب اس نے اپنی خود نوشت لکھی تو گویا اس نے تاریخ کو اپنی آواز دے دی۔ اب وہ محض کسی اور کی کہانی کا کردار نہیں بلکہ اپنی کہانی کی راوی ہے۔ یہ عمل اس کی شناخت کا سب سے بڑا ثبوت ہے کیونکہ جو شخص اپنی داستان خود لکھتا ہے وہ دوسروں کی تعریف پر انحصار نہیں کرتا۔

خواتین کی خود نوشتوں میں ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عورت نے اپنی شناخت کو صرف دکھ اور محرومی سے وابستہ نہیں کیا بلکہ امید اور خواب سے بھی جوڑا۔ وہ اپنی جدوجہد کو محض شکست کے بیانیے تک محدود نہیں رکھتی بلکہ اس میں کامیابی کی کرن بھی دکھاتی ہے۔ اس کے الفاظ میں کبھی صبر کی روشنی جھلکتی ہے، کبھی حوصلے کی چمک اور کبھی خوابوں کی وہ رنگینی جو سب دکھوں کے باوجود زندہ رہتی ہے۔ یہ رنگ عورت کی شناخت کو ایک نئے معنی دیتے ہیں۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کی پہچان صرف ماضی کے زخموں میں نہیں بلکہ مستقبل کی امیدوں میں بھی ہے۔

ان خواتین کی خود نوشتوں میں شناخت کے کئی پرتیں نظر آتی ہیں۔ سماجی سطح پر وہ خاندان اور معاشرے میں اپنی حیثیت منوانا چاہتی ہیں۔ ثقافتی سطح پر وہ اپنی زبان، ادب اور تہذیبی ورثے کے ذریعے پہچان قائم کرتی ہیں۔ فکری سطح پر وہ تعلیم اور شعور کے ذریعے اپنے باطن کو شناخت بخشتی ہیں۔ وجودی سطح پر وہ اپنے جسم، خوابوں اور جذبات کو اپنی ذات کا حصہ ماننے کا اعلان کرتی ہیں۔ سعیدہ بانو احمد اور نفیس بانو شمع کے ہاں عورت کے طبقاتی اور سماجی مسائل اُجاگر

ہوتے ہیں اور ان سب میں ایک بنیادی سوال موجود ہے کہ کیا نئی ریاست میں عورت محض خاندان کے استحکام کی علامت ہے یا اپنی حیثیت میں بھی ایک مکمل فرد ہے؟ یہ سب پر تیں مل کر عورت کی ایک کثیر الجہتی اور بھرپور تصویر پیش کرتی ہیں۔ نفیس بانو شمع لکھتی ہیں:۔

> ''میں نے محسوس کیا کہ تقسیم نے صرف زمین نہیں بانٹی، بلکہ انسانوں کی شناختوں کو بھی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ میں کہاں کی ہوں؟ اس سوال نے مجھے برسوں ستایا۔''(5)

پاکستان جیسے معاشرے میں جہاں پدر شاہی رویے گہرے تھے، عورت نے اپنی تحریروں سے مزاحمت کی، اپنے وجود کا اثبات کیا اور یہ پیغام دیا کہ شناخت کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ ان تحریروں نے آنے والی خواتین لکھاریوں کے لیے راستہ ہموار کیا کہ وہ اپنی سچائیاں مزید جرات کے ساتھ بیان کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان خود نوشتوں نے نہ صرف ادبی دنیا کو متاثر کیا بلکہ فکری اور سماجی مباحث کو بھی نئی جہت دی۔ عورت کی شناخت کی جدوجہد فرد اور معاشرے دونوں کے لیے چیلنج ہے۔ وہ ماضی کی روایات اور حال کے تقاضوں کے بیچ ایک مستقل کشمکش میں ہے۔ اس کشمکش نے اکثر ان کی تحریروں میں اضطراب پیدا کیا مگر یہی اضطراب ان کے لیے تخلیقی قوت بھی ثابت ہوا۔ ان کی تحریریں ایک اجتماعی نسائی شعور کی تشکیل کرتی ہیں جس میں شناخت کو جامد نہیں بلکہ ارتقائی عمل کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ وقت اور حالات کے ساتھ عورت نے اپنی پہچان کو نئے سرے سے دریافت کیا اور یہ ثابت کیا کہ وہ بکھرنے کے باوجود آخر کار ایک مضبوط اور جرات مند وجود ہے۔ شناخت کے حوالے سے بیگم انیس قدوائی آزادی کی چھاؤں میں لکھتی ہیں:۔

> ''میں بڑی حویلی میں پیدا ہوئی عجیب حقیقت ہے کہ بڑی حویلی کو اپنا گھر کہتے ہوئے ایک سفاک یاد میرے روبرو آجاتی ہے جب مجھے اچانک احساس ہوا تھا کہ میں یہاں ہوں لیکن یہ میرا گھر نہیں۔''(6)

نفیس بانو شمع نے اپنی خود نوشت میں بیان کیا ہے کہ عورت نے قیام پاکستان کے بعد اپنی ذات کو دوسروں کی آنکھ سے دیکھنا چھوڑ دیا اور اپنی آنکھ سے پرکھنا شروع کیا۔ یہی عمل شناخت کی بازیافت ہے۔ عورت نے اپنے دکھ، خواب، محبت اور مزاحمت کو الفاظ میں ڈھال کر ادب اور تاریخ دونوں پر نقش کر دیا۔ اس نے ثابت کیا کہ وہ صرف سماجی ڈھانچے کا ایک جزو نہیں بلکہ ایک مکمل انسان ہے جو اپنی پہچان کی جستجو میں کبھی نہیں تھکتی۔ یہی وہ ورثہ ہے جو خواتین

کی خودنوشتوں نے دیا کہ عورت کی شناخت کا سوال محض وقتی نہیں بلکہ انسانی وجود کا سب سے بنیادی سوال ہے۔ نفیس بانو شمع لکھتی ہیں:۔

"والدین نے میری شناخت کے لیے مجھے نفیس کا نام دیا، لیکن جب میرے ماضی اور حال کے جلتے تپتے شب و روز نے مجھے اپنے وجود میں بوند بوند کر کے اترتی آگ کا احساس دلایا تو میں نے اپنے نام کے ساتھ شمع کا اضافہ کر لیا اور جب سے آج تک جل رہی ہوں، لگتا ہے میری تخلیق کے لیے مٹی بھی جہنم سے اُٹھائی گئی ہو گی۔ اب یہ حالت ہے کہ مکمل آگ کے حصار میں ہوں۔

اب اس سے بڑھ کے بتا اور کیا سزا دے گا
میں اپنے جسم میں اک قید با مشقت ہوں

(7)

نفیس بانو شمع اپنی خودنوشت "جنت سے نکالی ہوئی ہوا" میں عورت کی شناخت کا مسئلہ نہایت شدت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ وہ بار بار اپنے ماحول کے خلاف ایک احتجاجی لہجہ اختیار کرتی ہیں۔ ان کے ہاں عورت کو محض ایک صنفی کردار کے بجائے ایک جیتا جاگتا فرد دکھایا گیا ہے جو اپنی رائے رکھنے اور اپنے فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن سماج کی آنکھوں میں وہی عورت ''باغی'' اور ''بے پردہ'' قرار پاتی ہے۔ یہ کشمکش نفیس کی شناخت کا بنیادی سوال ہے کہ وہ اپنی اصل پہچان کو سماج سے الگ کیسے منوائیں۔

ممتاز شیریں نے "شریں کتھا" میں لکھا ہے کہ معاشرتی دباؤ نے عورت کی ذات کو محدود کر دیا۔ ایک طرف روایتی اقدار نے عورت کو حجاب، گھریلو ذمے داریوں اور مردانہ اقتدار کے دائرے میں قید رکھا، اور دوسری طرف جدید تعلیم اور بیداری نے انہیں اپنی خودی کے اظہار پر آمادہ کیا۔ یہ دو متضاد قوتیں اکثر عورت کی شناخت میں تضاد اور کشمکش پیدا کرتی رہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد مذہب کو ریاستی شناخت کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس نے خواتین کی ذاتی شناخت کو بھی متاثر کیا۔ بہت سی خواتین کے لیے یہ سوال اہم بن گیا کہ ان کی حیثیت بطور مسلمان عورت کیا ہے؟ کیا ان کی شخصیت کو صرف مذہب کے آئینے میں دیکھا جائے گا یا ان کے ذاتی خواب اور خواہشات بھی اس کا حصہ ہوں گے؟ ان خودنوشتوں میں بارہا یہ دکھائی دیتا ہے کہ عورتیں اپنے اندر مذہبی، ثقافتی اور ذاتی شناخت کو ہم آہنگ کرنے کی جستجو کرتی ہیں۔

شناخت کے حوالے سے ممتاز شیریں لکھتی ہیں:۔

> ''میرا وطن کونسا ہے؟ہندو پور جہاں میرے بزرگ رہتے ہیں اور جہاں میں پیدا ہوئی یا میسور جہاں میں پلی بڑھی، تعلیم حاصل کی، شادی کی بچپن اور جوانی کا زمانہ گزارا جہاں اب میرے نانا جان ہیں،امی اور بھائی ہیں یا پھر پاکستان جس کی تقدیر سے میں نے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا اور جو میرا روحانی وطن ہے۔''(8)

ان خواتین کی خود نوشتوں میں زبان بھی ایک اہم علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اردو زبان ان کی شناخت کے اظہار کا بنیادی وسیلہ بنی۔ تاہم بعض خواتین نے یہ شکوہ بھی کیا کہ ان کی آواز کو سنجیدہ نہیں لیا گیا۔ ان کی تحریروں نے اس خاموشی کو توڑا اور شناخت کی بازیافت کا ذریعہ فراہم کیا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ خواتین اپنی ذات کی پہچان کو قومی بیانیے سے جدا نہیں کر سکیں۔ خود نوشتوں میں بارہا یہ دکھائی دیتا ہے کہ ذاتی دکھ اور قومی المیے آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ عورت اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی کردار بھی ادا کرنے پر مجبور رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ذات اور قوم کا بیانیہ ایک دوسرے میں مدغم دکھائی دیتا ہے۔

یہ خود نوشتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ عورت کی شناخت کا مسئلہ محض ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی اور تہذیبی بحران کا عکاس بھی ہے۔ یہ خود نوشتیں نہ صرف عورت کی ذات کی گواہی دیتی ہیں بلکہ معاشرتی ڈھانچے کے تضادات کو بھی بے نقاب کرتی ہیں۔ خواتین نے اپنی تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ وہ محض تاریخ کی تماشائی نہیں بلکہ اس کی تشکیل کرنے والی فعال کردار بھی ہیں۔ یوں ان کی خود نوشتیں شناخت کے سوال کو ایک ہمہ جہتی، پیچیدہ اور تجزیاتی انداز میں پیش کرتی ہیں۔ شناخت کے حوالے سے صفیہ اختر لکھتی ہیں:۔

> ''خواتین کی خود نوشتوں میں شناخت کا مسئلہ محض ذاتی تجربہ نہیں بلکہ ایک گہرا سماجی و نفسیاتی عمل ہے۔ عورت جب اپنی زندگی کو بیان کرتی ہے تو وہ دراصل اس معاشرتی نظام کو بے نقاب کرتی ہے جس نے اس کی ذات کو محدود یا مسخ کیا۔ پاکستانی اور جنوبی ایشیائی خواتین کی خود نوشتیں اس لحاظ سے نہایت اہم ہیں کہ ان میں عورت کی اپنی ''میں'' کے حوالے سے مسلسل کشمکش، سوالات اور مزاحمت کا عمل واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔''(9)

قیام پاکستان کے بعد خواتین کی خود نوشتوں کو پڑھنا ایک ایسے عہد کے سماجی و تہذیبی نقشے کو سمجھنے کے مترادف ہے جو صدموں، قربانیوں اور شدید ذہنی کشمکش سے عبارت تھا۔ عورت کا وجود اس کرب سے سب سے زیادہ متاثر ہوا کیونکہ وہ نہ صرف ایک فرد تھی بلکہ خاندان کی اساس، روایات کی امین اور تہذیب کی نمائندہ بھی تھی۔ اس

لیے اس کی زندگی پر پڑنے والے اثرات کئی جہتوں کے حامل تھے۔ یہی اثرات ان خواتین کی خود نوشتوں میں شناخت کے مسائل کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ عورت نے ایک نئے معاشرتی اور قومی ڈھانچے میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کی لیکن اس جدوجہد میں اس کے وجودی اور نفسیاتی سوالات مسلسل ابھرتے رہے۔

خواتین کی ایک بڑی تعداد نے اپنی تعلیم اور فکری سفر کو شناخت کا ذریعہ بنایا۔ وہ اپنی خود نوشتوں میں اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ شعور اور قلم نے انہیں اپنے وجود کو پہچاننے اور منوانے کا موقع دیا۔ لیکن یہ راستہ بھی آسان نہ تھا۔ مردانہ معاشرے نے ان کی آواز کو کم تر سمجھا، ان کی تحریروں کو غیر سنجیدہ قرار دیا اور ان کے قلم کو مشکوک نگاہ سے دیکھا۔ اس مخالفت کے باوجود عورت نے اپنی شناخت کو قلم کے ذریعے ثابت کیا۔ وہ اپنے تجربات کو بیان کر کے نہ صرف اپنی ذات کو پہچاننے میں کامیاب ہوئیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک فکری ورثہ چھوڑ گئیں۔

عورت نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ سماج اس کے جسم کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور اسے محض تابع کردار کے طور پر دیکھتا ہے۔ خود نوشت نگار خواتین بتاتی ہیں کہ کس طرح انہیں اپنے جسم اور خواہشات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق چھینا گیا۔ یہ بیانیہ عورت کے وجودی سوال کو مزید پیچیدہ کرتا ہے۔ وہ اپنے اندر اس آرزو کو پاتی ہیں کہ وہ آزاد ہوں، اپنی خواہشات پر قابو پائیں اور اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں لیکن سماج انہیں اس کا موقع نہیں دیتا۔ یہی کشمکش ان تحریروں کو زیادہ موثر اور سچائی سے قریب بنا دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز ہے'' اس حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس میں عورت کی شناخت کو تہذیبی، تاریخی اور خاندانی سطح پر دیکھا گیا ہے۔ وہ اپنی جڑوں کو تلاش کرتے ہوئے یہ دکھاتی ہیں کہ عورت کا وجود کسی ایک لمحے یا کسی ایک جگہ سے وابستہ نہیں بلکہ تہذیبوں اور تاریخوں کے تسلسل میں تشکیل پاتا ہے۔ ان کے ہاں قومی شناخت کا پہلو غالب ہے۔ وہ اپنی ذات کو قومی جدوجہد کے ساتھ وابستہ کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ عورت کی شناخت صرف گھریلو دائرے تک محدود نہیں بلکہ قومی سطح پر بھی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے ہاں عورت کی شناخت کا مسئلہ قومی، جنسی اور وجودی سطح پر سامنے آتا ہے۔ وہ سماج کے اس رویے کو للکارتی ہیں جو عورت کو تابع کردار سمجھتا ہے۔ ان کی تحریر میں بغاوت اور احتجاج کا رنگ نمایاں ہے جو عورت کی شناخت کے حق میں ایک مضبوط آواز ہے۔ یہی کیفیت عورت کو اپنی ذات پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ ماضی کو یاد کرتے ہوئے محسوس کرتی ہے کہ اس کی شناخت کے کئی حصے بکھر گئے ہیں۔ بچپن کی خوشبو، ماں باپ کی شفقت، گھر کا سکون یہ سب اس کی پہچان کا حصہ تھے۔ اب جب یہ

سب چھن گیا تو اسے اپنی ذات کو نئے سرے سے تراشنا ہے۔ یہ تراشنا آسان نہیں تھا کیونکہ سماج کے دباؤ اور روایت کی زنجیریں اب بھی موجود تھیں۔ عورت کو ایک طرف خاندان کی عزت کا بوجھ اٹھانا پڑتا تھا اور دوسری طرف اپنے اندر کی پکار سننی پڑتی تھی جو اسے کہتی تھی کہ وہ اپنی انفرادیت کا حق مانگے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی خودنوشت "کارِ جہاں دراز ہے" میں ہجرت کے زخم اور تہذیبی بکھراؤ کو شناخت کے مسئلے کے ساتھ جوڑا وہ لکھتی ہیں:

"تقسیم نے ان کے وجود کو دو حصوں میں بانٹ دیا ایک حصہ جو ہندوستانی روایتوں سے جڑا تھا اور دوسرا حصہ جو پاکستان کی نئی تشکیل میں شامل تھا۔" (10)

ادا جعفری جیسی ادیبہ نے اپنی خودنوشت میں عورت کی ادبی شناخت کو موضوع بنایا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ کس طرح قلم عورت کے لیے آزادی کا ذریعہ بنتا ہے۔ ان کے نزدیک تخلیق ہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے عورت اپنے وجود کو ثابت کر سکتی ہے۔ یہ خواتین نہ صرف اپنی زندگی کے مسائل کو بیان کرتی ہیں بلکہ ایک بڑے فکری اور سماجی تناظر میں عورت کی آواز کو جگہ دیتی ہیں۔

ان تمام خودنوشتوں کا ایک اہم پہلو ان کا نفسیاتی رنگ ہے۔ تقسیم اور ہجرت کے صدمے نے عورت کے اندر خوف، اجنبیت اور احساسِ کمتری پیدا کیا۔ وہ اپنے اندر اس سوال کو لیے پھرتی ہے کہ کیا اس کی قربانیاں کبھی تسلیم کی جائیں گی؟ کیا اس کے دکھ اور جدوجہد کو کبھی مانا جائے گا؟ یہی نفسیاتی کشمکش ان تحریروں میں جگہ جگہ جھلکتی ہے۔ عورت اپنی تحریروں میں ان زخموں کو بیان کر کے اپنی ذات کو تسلی دیتی ہے اور قاری کے سامنے اپنی سچائی رکھتی ہے۔

ادا جعفری نے اپنی تعلیم اور فکری سفر کو اپنی شناخت کا مرکز بنایا۔ ان کے نزدیک قلم اور شعور ہی وہ وسیلہ تھا جس کے ذریعے وہ اپنی ذات کو منوا سکتی تھیں۔ لیکن اس راستے پر بھی انہیں مزاحمت کا سامنا رہا۔ معاشرہ عورت کے تخلیقی وجود کو کم تر سمجھتا تھا، مگر ان خواتین نے اپنی خودنوشتوں کے ذریعے ثابت کیا کہ عورت صرف گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں بلکہ وہ تخلیق، فکر اور ادب کے ذریعے اپنی شناخت قائم کر سکتی ہے۔

ادا جعفری لکھتی ہیں:۔

"میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ دو دنیاؤں کے بیچ پایا، ایک وہ جہاں میں آزاد تھی، اور دوسری جہاں عورت ہونے کی سزا بھگتنی پڑتی تھی۔" (11)

درحقیقت شناخت انسانی وجود کی بنیادی جہت ہے جو فرد کو سماجی، ثقافتی اور تاریخی حوالوں سے پہچان عطا

کرتی ہے۔ خود نوشت کی صنف میں یہ شناخت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ فرد اپنی ذات کو بیان کرتے ہوئے نہ صرف اپنے ذاتی تجربات پیش کرتا ہے بلکہ اس سماج کی پر تیں بھی کھولتا ہے جس میں اس کی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ خواتین کی خود نوشت میں یہ شناخت صنفی دباؤ، پدر سری نظام اور اجتماعی رویوں کے خلاف ایک احتجاجی بیانیہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ شناخت کی ایک اہم جہت مزاحمت ہے۔ خاص طور پر نوآبادیاتی یا طبقاتی پس منظر رکھنے والی خواتین اپنی خود نوشت میں ان جبر اور تعصبات کو بے نقاب کرتی ہیں جنھوں نے ان کی شخصیت پر اثر ڈالا۔ یہ مزاحمتی لہجہ صرف ذاتی نجات نہیں بلکہ اجتماعی شعور کو بیدار کرنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد خود نوشت نگاری میں شناخت کو ''متعدد آوازوں'' کا امتزاج قرار دیا جاتا ہے۔ ایک ہی متن میں مصنفہ کبھی ماں، کبھی بیٹی، کبھی پیشہ ور، کبھی مظلوم اور کبھی مزاحمت کار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہ کثرت شناخت قاری کو یہ احساس دلاتی ہے کہ انسانی ذات کو ایک ہی تعین یا ایک ہی لیبل میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ خواتین کی خود نوشتوں میں شناخت کا سب سے نمایاں پہلو "خاموشی کو توڑنا" ہے۔ بہت سی مصنفات اپنے تجربات کو تحریر میں لا کر ان روایتی رکاوٹوں کو توڑتی ہیں جو صدیوں تک ان کی آواز کو دبائے رکھتی ہیں۔ اس اظہار کے ذریعے وہ اپنی ذات کو نہ صرف تسلیم کرواتی ہیں بلکہ نئی نسل کے لیے راہیں بھی ہموار کرتی ہیں۔

روح افزا حید کی ''دلی یاد آتی ہے'' پڑھ کر قاری پر تاثر پڑتا ہے کہ نوآبادیاتی پس منظر رکھنے والی خواتین کی خود نوشتوں میں شناخت کا مسئلہ دوہری شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ اپنی ثقافتی جڑوں سے جڑی ہوتی ہیں اور دوسری طرف استعماری نظام نے ان پر نئی قدریں اور زبانیں مسلط کی ہوتی ہیں۔ اس طرح ان کا بیانیہ "دوہری شناخت" (double consciousness) کی نمائندگی کرتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کی خود نوشتوں میں شناخت کا تصور "متحرک بیانیہ" کے طور پر سامنے آتا ہے۔ روح افزا اپنے ماضی کو محض بیان نہیں کرتی بلکہ اس کی نئی تعبیر پیش کرتی ہے، گویا وہ اپنی ذات کو بار بار لکھنے اور گھڑنے کے عمل سے گزرتی ہے۔ یہ پہلو اس بات کو واضح کرتا ہے کہ شناخت جامد نہیں بلکہ مسلسل ارتقاپذیر عمل ہے۔ روح افزا لکھتی ہیں:

> ''ہجرت نے میرے وجود میں جو خلا پیدا کیا، وہ صرف رہائش بدلنے کا خلا نہ تھا بلکہ اپنی اصل پہچان کے چھن جانے کا وہ گہرا زخم تھا جسے لفظوں میں قید کرنا آسان نہیں۔ دلی سے رخصتی گویا اپنے ہی اندر سے جُدا ہونے کا تجربہ تھی۔ میں جہاں بھی گئی، نئے شہر اور نئے لوگ میرے لیے

اجنبی نہیں تھے، مگر ان سب کے بیچ میں اپنا آپ ڈھونڈنے کی ایک مسلسل کشمکش ضرور تھی۔ اکثر یوں محسوس ہوتا کہ میرا آدھا وجود دلی کی گلیوں میں رہ گیا ہے اور آدھا وجود اس نئی سرزمین پر اپنے لیے جگہ تلاش کر رہا ہے۔ میرے اندر ایک مسلسل آواز اٹھتی تھی کہ شناخت محض سرحدوں کا نام نہیں، یہ تو یادوں، بولیوں، خوشبوؤں اور ان قدموں کی چاپ سے بنتی ہے جو ہمارے بچپن کی مٹی میں گونجتی رہتی ہیں۔ دلی کی تہذیب، اس کا چلن، اس کا لہجہ اور وہاں کے دن رات میری شخصیت کے دھاگوں میں اس طرح بُنے ہوئے تھے کہ ان کے بغیر خود کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ وقت کے ساتھ میں نے جانا کہ شناخت کوئی ٹھہری ہوئی چیز نہیں، یہ بدلتی رہتی ہے، مگر اس کا بنیادی رنگ ہمیشہ اپنی اصل سرزمین اور اپنے ماضی سے آتا ہے۔ میں نے نئے ماحول میں گھلنے کی پوری کوشش کی، مگر دل کے ایک کونے میں دلی کی وہ روشنی ہمیشہ جگمگاتی رہی جو مجھے یاد دلاتی تھی کہ میرا تعلق کہاں سے ہے اور میرا وجود کن حوالوں سے تشکیل پاتا ہے۔ یہی احساس مجھے بار بار یہ سوچنے پر مجبور کرتا کہ انسان اپنی پہچان کہیں چھوڑ نہیں آتا، وہ اسے اپنے اندر اٹھائے پھرتا ہے۔ چاہے فاصلے کتنا ہی بڑھ جائیں یا وقت کتنی ہی دیر گزر جائے۔"(12)

قیام پاکستان کے بعد خواتین کی خودنوشتیں اس دور میں ایک ایسا آئینہ بن کر سامنے آئیں جس میں ہم عورت کے دل کی وہ سچائیاں دیکھ سکتے ہیں جو رسمی تاریخ میں جگہ نہیں پا سکیں۔ ان تحریروں میں عورت اپنے وجود کا نوحہ بھی لکھتی ہے اور اپنے عزم کا اعلان بھی کرتی ہے۔ وہ کبھی یادوں کے دریچوں میں جھانکتی ہے تو کبھی حال کی سختیوں کو بیان کرتی ہے۔ یہ خودنوشتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ عورت کے لیے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ اپنے وجود کو کس بنیاد پر پہچانے۔ کیا وہ محض ایک ہجرت زدہ وجود ہے؟ کیا وہ نئی ریاست کی شہری ہے؟ کیا وہ اپنے ماضی کی اسیر ہے؟ یا پھر وہ ایک ایسا فرد ہے جو ان سب حوالوں کو ساتھ لے کر بھی اپنی الگ پہچان کا حق رکھتی ہے؟

ان میں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ عورت نے اپنی شناخت کے لیے قلم کو سب سے بڑا ہتھیار بنایا۔ تحریر اس کے لیے ایک ایسا وسیلہ بنی جس کے ذریعے اس نے اپنی ذات کو تسلیم کروایا۔ وہ جب اپنی کہانی سناتی ہے تو دراصل یہ کہتی ہے کہ اس کی زندگی بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ وہ اپنے دکھوں، خوابوں اور تجربوں کو الفاظ میں ڈھال کر یہ اعلان کرتی ہے کہ اس کا وجود کسی حاشیے پر لکھا ہوا باب نہیں بلکہ متن کا مرکزی کردار ہے۔ یہاں یہ بھی دلچسپ پہلو ہے کہ خودنوشت لکھنا ہی عورت کے لیے ایک تخلیقی مزاحمت ہے۔ صدیوں تک اسے خاموش رکھا گیا، اس کی زبان کو دبایا گیا، مگر

جب اس نے قلم اٹھایا تو یہ ایک اعلان تھا کہ وہ اب اپنی کہانی خود بیان کرے گی۔ یہ خودنوشتیں دراصل عورت کا اپنے وجود پر حق جتانے کا عمل ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے ذریعے یہ باور کراتی ہیں کہ شناخت جامد نہیں بلکہ متحرک ہے، جو وقت، حالات اور تجربات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

خواتین کی خودنوشتیں اس بات کی بھی گواہی دیتی ہیں کہ عورت نے اپنے اندر ایک خاموش مزاحمت پیدا کر لی تھی۔ وہ کبھی کھل کر احتجاج نہ کر سکی لیکن اپنی تحریر میں اس نے اپنی ناراضی کو الفاظ کا روپ دیا۔ وہ اپنے دکھ کو بیان کر کے یہ باور کراتی ہے کہ وہ محض خاموش کردار نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ اس کی شناخت دوسروں کی عطا نہیں بلکہ اس کا اپنا حق ہے۔ یوں یہ تحریریں صرف ادبی متون نہیں بلکہ نفسیاتی اور سماجی دستاویزات بھی ہیں۔ ان میں عورت کے دل کی وہ دھڑکنیں محفوظ ہیں جو تاریخ کے شور میں دب گئی تھیں۔ یہ بیانیے پڑھنے والے کو یاد دلاتے ہیں کہ عورت کی شناخت محض اس کی جنس سے طے نہیں ہوتی بلکہ اس کے خوابوں، اس کی جدوجہد اور اس کے تجربوں سے بنتی ہے۔ آج کی عورت جب ان خودنوشتوں کو پڑھتی ہے تو اسے اپنے ماضی سے جڑنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ اس کی جدوجہد کسی نئی حقیقت کا حصہ نہیں بلکہ ایک طویل تاریخی تسلسل ہے۔ ماضی کی عورت نے بھی اپنی آزادی اور وقار کے لیے انہی مسائل سے گزر کر راستہ بنایا تھا۔ یہی تسلسل آج کی عورت کو ہمت دیتا ہے کہ وہ اپنی شناخت کے سفر کو جاری رکھے۔ ان خودنوشتوں کی اہمیت یہی ہے کہ یہ صرف ذاتی داستانیں نہیں بلکہ پاکستانی عورت کی اجتماعی تاریخ بھی ہیں۔ ان میں جھلکتے ہوئے مسائل یہ بتاتے ہیں کہ عورت نے ہمیشہ اپنے وجود کو پہچاننے اور منوانے کے لیے جدوجہد کی ہے اور یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 41, Issue No. 2, Dec 2025

حوالہ جات وحواشی

1۔ صبیحہ انور، ڈاکٹر، اردو میں خود نوشت سوانح حیات (لکھنؤ: نامی پریس، 1948)، ص367

2۔ عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیرہن (نئی دہلی: مکتبہ پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس 1994)، ص167

5 کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2008)، ص35، ایضاً، ص190

5۔ نفیس بانو شمع، جنت سے نکالی ہوئی حوا، (نئی دہلی: آبشار پبلی کیشنز، 1998)، ص233

6۔ بیگم انیس قدوائی، آزادی کی چھاؤں میں، (نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، 1997)، ص98

7۔ نفیس بانو شمع، جنت سے نکالی ہوئی حوا، (نئی دہلی: آبشار پبلی کیشنز، 1998)، ص101

8۔ ممتاز شیریں، شیریں کتھا، (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، 2016)، ص4

9۔ صفیہ اختر، زیرِ لب، مرتبہ جاں نثار اختر (بمبئی: علوی بک ڈپو، 1989)، ص178

10۔ قراۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، 2003)، ص172

11۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی (کراچی: مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز، 1995)، ص123

12۔ روح افزا حیدر، دلی یاداتی ہے (لاہور: ایف ڈی پرنٹرز، 1991)، ص25